تزکیہ کے عام فہم اور قابل عمل تصور کا احیاء

(مولانا امین احسن اصلاحی کی فکر کی روشنی میں)

ڈاکٹر اختر حسین عزمی*

انبیاء کرام کی بعثت سے اللہ کا حقیقی مقصود:

نفوس انسانی کے تزکیہ کے لئے اللہ نے نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری کیا۔اسی کے لئے شریعت اور کتابیں نازل فرمائیں۔سیدنا حضرت ابراہیمؑ نے آنحضرتؐ کی بعثت کے لئے جو دعا فرمائی اس میں اصلی غایت یہی بیان فرمائی ہے کہ آپ لوگوں کا تزکیہ کریں: ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلوا علیھم آیاتک ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ ویزکّیھم [1] اللہ نے بھی آپؐ کی بعثت کے مقاصد کا حوالہ ان الفاظ میں دیا ہے: کما ارسلنا فیکم رسولاً منکم یتلوا علیکم ایٰتنا ویزکّیکم ویعلّمکم الکتاب والحکمۃ [2] یہی بات سورہ جمعہ کی آیت ۲۰ میں کہی گئی ہے اور اسی بات کو اللہ نے مومنین پر اپنا احسان قرار دیا ہے: لقد منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیٰتہٖ ویزکّیھم ویعلّمھم الکتٰب والحکمۃ [3]

ان آیات میں تزکیہ کے ساتھ تلاوتِ کتاب اور تعلیمِ کتاب وحکمت بھی اسی اہمیت کے ساتھ مذکور ہوئی ہیں تو پھر اصلی مقصد صرف تزکیہ ہی کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس بارے میں مولانا اصلاحیؒ فرماتے ہیں۔

''خود قرآن مجید کے اسلوبِ بیان نے یہ حقیقت واضح کردی ہے کہ مذکورہ آیات میں نبیؐ کے اصلی مقصدِ بعثت کی حیثیت سے جس چیز کا ذکر ہوا ہے، وہ تزکیہ ہے، باقی اس کے ساتھ دوسری چیزیں تلاوت آیات اور تعلیم کتاب وحکمت جو مذکور ہوئی ہیں وہ اصلی مقصد کی حیثیت سے نہیں بلکہ اصلی مقصد کے وسائل وذرائع کی حیثیت سے مذکور ہوئی ہیں۔اس کی دلیل یہ ہے کہ سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا دونوں آیتوں میں سے ایک آیت میں تزکیہ کا لفظ سب سے آخر میں اور دوسری آیت میں سب کے شروع میں آیا ہے............اس تقدیم وتاخیر سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ نبیؐ کی تمام جدوجہد اور اس کی تمام سرگرمیوں کا محور ومقصود دراصل تزکیہ ہی ہے کیونکہ اصل مقصد ہی کی یہ اہمیت ہوتی ہے کہ وہ

---

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج پتوکی، قصور۔

شروع میں بھی ایک کام کرنے والے کے پیش نظر ہوتا ہے اور آخر میں بھی۔ وہی اس کی سرگرمیوں کا نقطہ آغاز بھی ہوتا ہے اور وہی نقطہ اختتام بھی...... کسی اسکیم کے اندر جو چیز مقصدی اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ عمل میں اگرچہ موخر ہوتی ہے لیکن ارادہ و خیال میں مقدم ہوتی ہے۔ آپ ایک مکان کی تعمیر سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سکونت کی راحت ہے اور ہر چیز عین اس وقت بھی آپ کے سامنے ہوتی ہے جبکہ آپ ایک مکان کا نقشہ ابھی کاغذ پر بنا رہے ہوتے ہیں۔ حالانکہ عملاً یہ چیز حاصل اس وقت ہوتی ہے جب مکان بن چکتا ہے۔'' [4]

گویا کہ انبیاء کرام کا اصلی مقصد تو لوگوں کے نفوس کا تزکیہ ہی ہوتا ہے لیکن اس مقصد کی خاطر انہیں بہت سے ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں جو حصولِ مقصد کا وسیلہ وذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کیلئے وہ تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں قرآن مجید کی صراحت کے مطابق تزکیہ ہی وہ اصلی کام ہے جس کیلئے لوگوں کو نبیؐ سے رجوع کرنا چاہئے اور نبی کا فرض ہے کہ جو لوگ اس غرض کیلئے اس سے رجوع کریں ان کو ہرگز مایوس نہ کریں۔ چنانچہ ایک موقع پر جب نبیؐ سے بعض اسباب کی بنا پر ایک طالب تزکیہ کے معاملے میں معمولی سی غفلت ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی: عبس وتولّی ان جاءہ الاعمٰی ومایدریك لعلّه یزّکّی [5]

اس آیت سے بالکل واضح ہو رہا ہے کہ نبیؐ خلق خدا کی جس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے بھیجا جاتا ہے، وہ ان کے نفوس کا تزکیہ ہے، اس وجہ سے لوگوں کو یہ حق ہے کہ اس غرض کیلئے وہ نبیؐ سے رجوع کریں اور نبی کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرے۔ [6]

آنحضورؐ کی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد اصلی اسی چیز کو قرار دیا گیا جیسے فرمایا: اذھب الی فرعون انه طغی فقل ھل لك الیٰ ان تزکّی [7] قرآن مجید اس حقیقت پر بھی شاہد ہے کہ فلاح ونجات آخرت کا انحصار بھی تزکیہ نفس پر ہے: قد افلح من زکّھا وقد خاب من دسّٰھا [8] دوسرے مقام پر فرمایا: قد افلح من تزکّی [9] ظاہر ہے کہ جب آخرت میں انسان کی نجات وفلاح تزکیہ حاصل کرنے پر منحصر ہوئی تو انبیاءؑ کا، جو انسانیت کے نجات دہندہ کی حیثیت سے دنیا میں مبعوث کئے جاتے ہیں، اصلی کام یہی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگوں کا تزکیہ نفس کریں اور ان کو

حصول تزکیہ کے طریقے بتائیں۔ [10]

اوپر کی بحث سے تین باتیں واضح ہوئیں؛ ایک یہ کہ منبع و مصدرِ تزکیہ کتاب اللہ ہے۔ اسی کی تعلیم سے تزکیہ کا آغاز ہوتا ہے اور پھر اس کے اسرار و حقائق نبیؐ کے ذریعے واضح ہو کر اس تزکیہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ یتلوا علیکم اٰیتنا ویزکیکم اور یتلوا علیھم آیاتہٖ ویزکیھم میں تلاوت آیات کو تزکیہ کے ساتھ اس طرح وابستہ کیا ہے کہ یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ تزکیہ درحقیقت تلاوت آیات ہی کے ثمرات و نتائج میں سے ہے۔

دوسری یہ کہ بعثت انبیاء کا اصلی مقصود تزکیہ ہی ہے۔ دوسری ساری چیزیں وسائل و ذرائع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انبیاءؑ کی سرگرمیاں خواہ ظاہر میں کتنے ہی مختلف پہلو رکھتی ہوں، لیکن باطن میں ان کا ہدف انسان اور انسانی معاشرہ کے تزکیہ کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ عمل تزکیہ، انسانی معاشرہ کے کسی خاص گروہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تمام افراد اور پورے معاشرے سے یکساں طور پر ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے بغیر آخرت میں نجات اور فلاح حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی حیثیت دین میں صرف ایک فضیلت کی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کیلئے ایک ناگزیر انفرادی ضرورت کی ہے۔ یہ نجات اور فلاح آخرت کیلئے ایک ضروری شرط ہے، جس کو پورا کئے بغیر کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ [11]

تزکیہ، ایک آسان عمل:

جب تزکیہ نفس ہر ایک کیلئے ضروری ہوا تو یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کا حصول ہر ایک کے بس میں ہو۔ اس کے اصول عام فہم، راستہ آسان اور طریقہ قابلِ عمل ہو، کیونکہ بنیادی اہمیت کی چیز نہ تو راز ہو سکتی ہے اور نہ ناقابل عمل۔ چنانچہ قرآن جو مصدر تزکیہ ہے، اس کو اللہ نے تذکیر کیلئے آسان قرار دیا ہے: ولقد یسّرنا القرآن للذّکر فھل من مدّکر [12] تیسیرِ قرآن کے اس پہلو کا اظہار اس سورت میں مسلسل چار بار کیا گیا ہے۔ گویا کہ تزکیہ کے عمل کا پیچیدہ، ناقابل فہم اور ناقابل عمل ہونا اس کی اصل فطرت کے خلاف ہے۔

مولانا نے تزکیہ نفس کے اسی پہلو کو اجاگر کیا ہے وہ اہل تصوف کے تصور تزکیہ کی مشکلات

کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک چیز کا جو اعلیٰ معیار وہ پیش کرتے ہیں۔ اگر کتاب وسنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ یہ مقام کتاب وسنت کے مقام سے ایک مافوق مقام ہے۔ یہاں تک کہ اگر اصلی معیار اس کو مان لیجئے تو صحابہؓ بھی اسی معیار پر شاید ہی پورے اتر سکیں۔ اس چیز کا اثر طبیعت پر یا تو مایوسی کی شکل میں پڑتا ہے۔ آدمی یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ باتیں ہمارے دائرہ جدوجہد سے باہر ہیں یا پھر کتاب وسنت سے اس کو یہ بدگمانی پیدا ہوتی ہے کہ ان میں جو معیار پیش کیا گیا ہے، وہ صرف عام معیار ہے، عبدیت وانابت وغیرہ کا حقیقی معیار وہ ہے جو اہل تصوف پیش کرتے ہیں۔'' [13]

مولانا کے نزدیک صوفیانہ لٹریچر میں غلو کا سب سے زیادہ مظاہرہ صبر، شکر، زہد، قناعت، توکل، انابت، عبودیت، خشیت اور محبت ورضا کی حقیقتوں کے بیان میں ہوا ہے۔ یہ جاننے کیلئے وہ ''رسالہ قشیریہ''، ''قوت القلوب'' اور ''احیاء العلوم'' پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مولانا اصلاح نفس میں ان کے بار بار مطالعہ کی افادیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ فرماتے ہیں:

''لیکن جب آدمی ان کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے اور یہ چیز بھی اس کے پیش نظر ہوتی ہے کہ ان کو عملی زندگی میں اپنانا بھی ہے تو پھر وہ اکثر جگہ یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ باتیں اگرچہ بڑی ہی اعلیٰ، بڑی ہی پاکیزہ اور بڑی ہی زرّیں ہیں لیکن ان کو اپنانا صرف انہی بزرگوں کا کام تھا جنہوں نے لکھیں ہیں یا جو گذر چکے ہیں۔ اس زمانے میں انسان کا یہ ظرف نہیں ہے کہ وہ ان مقامات تک پہنچ سکے، بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان اپنے بشری تقاضوں سے دستکش ہوئے بغیر شاید ان کو اپنا ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ علامہ ابن قیم نے مدارج السالکین میں مقاماتِ سلوک پر بحث کرتے ہوئے جگہ جگہ یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر فلاں چیز کی حقیقت یہ ہے، جو ارباب تصوف پیش کرتے ہیں، تو پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس مقام کو صحابہ بلکہ انبیاءؑ بھی حاصل نہ کر سکے۔'' [14]

شیخ ابو اسمعیل ہرویؒ نے منازل السائرین، میں توبہ، توکل، صبر، رضا وغیرہ کی شرح میں ان کے تین تین درجے بیان کیے ہیں، مولانا اس بارے میں فرماتے ہیں:

''عموماً پہلے درجے ہی کا معیار ایسا بلند کرتے ہیں کہ آدمی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ قرآن آدمی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے وہ تو بس یہیں تک ہے اور اگر اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر ہے تو دوسرے میں

تو بہر حال پوری ہو جاتی ہے۔ رہا تیسرا درجہ تو صاف ایک مافوق بشریت درجہ معلوم ہوتا ہے۔ جو شیخ کے نزدیک تو کاملین کا درجہ ہوتا ہے لیکن اگر کوئی شخص کتاب وسنت کو معیار کامل مان کر اس کا تجزیہ کرے تو عموماً اس کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس درجے یا اس مقام کا کوئی وجود ہے تو وہ صرف شیخ کے ذہن میں ہے، نہ کتاب وسنت میں اس کا کوئی اشارہ ملتا ہے اور نہ عقل اور قیاس کی وہ گرفت میں آتا ہے۔" ۱۵

متصوفین کا معیارِ عبدیت وانابت:

حقیقت یہ ہے کہ اہل تصوف کے بارے میں مولانا نے جو بات کہی ہے وہ بہت حد تک درست ہے۔ صوفیا نے توحید ورسالت اور آخرت کا ایک ایسا تصور کھڑا کیا ہے کہ قرآن وسنت کی عام تعلیمات بھی اس معیار سے فروتر ہیں۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ہم قرآن اور اہل تصوف کی تعلیمات کا ایک تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہیں۔

توحید: قرآن کی رو سے توحید صرف یہ ہے کہ اللہ صرف اللہ کو مانا جائے جو ان تمام صفات کمال سے متصف اور عیوب ونقائص سے پاک ہے جنہیں عقل مانتی اور جن کی وضاحت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے سے کی ہے۔ اللہ کا لفظ عربی میں اس ہستی کے لئے بولا جاتا ہے جس کے لئے کسی نہ کسی درجے میں اسباب وعلل سے ماوراء امر وتصرف ثابت کیا جائے۔ قرآن مجید کے نزدیک کوئی ایسی صفت یا حق بھی اگر کسی کیلئے تسلیم کیا جائے جو اس امر وتصرف ہی کی بنا پر حاصل ہوسکتا ہو تو یہ درحقیقت اسے الٰہ بنانا ہے۔ چنانچہ وہ اس امر وتصرف اور ان حقوق وصفات کو صرف اللہ ہی کیلئے ثابت قرار دیتا ہے۔ بنی آدم سے اس کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ بھی اپنے ایمان وعمل اور طلب وارادہ میں اسے اللہ ہی کیلئے ثابت قرار دیں۔ شرک اس کی اصطلاح میں اس سے انحراف کی تعبیر ہے۔

اسی توحید پر اللہ کا دین قائم ہوا۔ یہی اس دین کی ابتداء یہی انتہا اور یہی ظاہر وباطن ہے۔ اسی کی دعوت تمام انبیاء اور تمام الہامی کتابوں نے دی۔ قرآن مجید از اول تا آخر اسی توحید کو بیان کرتا ہے۔ اور سورۂ اخلاص میں اس کی ذات اور آیت الکرسی اور سورۂ حشر کی آخری تین آیات میں اس کی صفات کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اس سے اوپر توحید کا کوئی درجہ نہیں ہے، جسے اس دنیا میں انسان حاصل کرنیکی کوشش کرے۔ لیکن اہل تصوف کے ہاں یہ توحید کا ابتدائی درجہ ہے جسے وہ عامۃ الناس کی توحید قرار دیتے ہیں۔ اس کی اہمیت ان کے نزدیک تمہید سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں

توحید کا اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ موجود صرف اللہ کو مانا جائے جس کے علاوہ کوئی دوسری ہستی درحقیقت موجود ہی نہیں ہے۔تمام تعیّناتِ عالم،خواہ وہ محسوس ہوں یا معقول،وجودِ حق سے منتزع اور محض اعتبارات ہیں،ان کے لئے خارج میں وجودحق کے سوااورکوئی وجودنہیں ہے۔ذاتِ باری ہی کے مظاہر کا دوسرا نام عالم ہے۔یہ باعتبار وجود خدا ہی ہے۔اس کیلئے اگر وجود ثابت کیا جائے تو یہ شرک فی الوجود ہوگا۔لاموجودالا اللہ سے اسی کی نفی کی جاتی ہے۔چنانچہ صاحب ''منازل السائرین'' لکھتے ہیں:

''التوحید علی ثلاثة اوجه،الوجه الاول؛ توحید العامة،وهو الذی یصح بالشواهد والوجه الثانی توحید الخاصة، وهو الذی یثبت بالحقائق. والوجه الثالث :توحید قائم بالقدم وهو توحید خاصة الخاصة.فاما التوحید الاول فهو شهادة ان الا الٰه الا اللّٰه وحده لاشریك له الاحد الصّمد الّذی لم یلد ولم یولد ولم یکن له کفواً احد، هذا هوا التوحید الظاهر الجلی الذی نفی الشرك الاعظم '' [۱۶]

جس توحید کوانہوں نے'' قائم بالقدم'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اس کی وضاحت وہ: انه اسقاط الحدث واثبات القدم [۱۶] کے الفاظ سے کرتے ہیں یہی بات غزالی نے لکھی ہے:

''الرابعة ان لایری فی الوجود الا واحداً وهی مشاهدة الصدّیقین وتسمیة الصوفیة الفنا فی التوحید لانه من حیث لایری الاّ واحداً فلایری نفسه ایضاً واذالم یرَنفسه لکونه مستغرقاً بالتوحید کانا فانیا عن نفسه فی توحیده.'' [۱۷]

ابن عربیؒ نے اپنی کتابوں،بالخصوص ''فصوص الحکم'' اور'' فتوحات مکیہ'' میں اسی عقیدہ کی وضاحت کی ہے کہ عارف وہی ہے جو ذاتِ حق اور ذاتِ عالم کو باعتبار حقیقت الگ الگ نہ سمجھے بلکہ جس کو جس سے،جس میں جس کے ذریعے سے دیکھے،سب کو اس اعتبار سے ذاتِ حق ہی قرار دے۔لکھتے ہیں:

فالا مر الخالق المخلوق والامر المخلوق الخالق، کل ذالك من عین واحدة لابل هو العین الواحد،وهو العیون الکثیرة [۱۸]

شیخ مجدد الف ثانیؒ نے صرف ممکنات کی ماہیت میں ابن عربی سے اختلاف کیا ہے۔تاہم اپنے اسی اختلاف کی بنا پر انہوں نے توحید شہودی کا نظریہ پیش کیا ہے۔ان کے بقول عالم چونکہ مرتبہ وہم میں بہر حال ثابت ہے،اس لئے نفی صرف شہود کی ہونی چاہئے۔ان کے نزدیک اس مقام پر

سالک اللہ کے سوا کچھ نہیں دیکھتا۔ چنانچہ اس وقت اس کی توحید یہ ہے کہ وہ مشہود صرف اللہ ہی کو مانے، لکھتے ہیں: ''توحید شہودی یکے دیدن است، یعنی مشہودِ سالک جز یکے نباشد'' [۱۹] شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب ''عبقات'' میں اسے تعبیر ہی کا فرق قرار دیا ہے۔ [۲۰]

قرآن میں نہ اثبات وجود کوئی شرک ہے اور نہ موجود یا مشہود صرف اللہ ہی کو قرار دینا توحید کا کوئی مرتبہ ہے۔ صرف یہی نہیں، قرآن جس توحید کی دعوت بنی آدم کو دیتا ہے وہ اس کے نزدیک ایک واضح حقیقت ہے جسے خود اللہ نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ جس کی تعریف اس کے نبیوں نے کی، جسے دلوں نے سمجھا، جس کا اقرار زبانوں نے کیا، جس کی گواہی اس کے فرشتوں اور سب اہل علم نے دی اور جس کا کوئی پہلو اب سننے والوں اور جاننے والوں سے پردۂ اخفا میں نہیں ہے۔ ارشاد باری ہے: شهد الله انه لااله الا هو والملٰئكة واولوالعلم قائما بالقسط، لااله الا هو العزيز الحكيم [۲۱]۔ اہل تصوف کے ہاں سالک جب توحید کے اسرار پر مطلع ہوتا ہے تو اس کی زبان اس کی تعریف اور اس کی تبلیغ سے عاجز اور الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہو جاتے [۲۲] جبکہ اللہ نے اپنے رسول کو اس بات کا مکلف ٹھہرایا ہے کہ وہ اس کی عام تبلیغ کریں اور اگر اس میں ان سے کوئی کوتاہی ہوئی تو یہ عین فرض رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی قرار پائے گی: يايها الرسول بلّغ ماانزل اليك من ربك وان لم تفعل فمابلّغت رسالته [۲۳]

شریعت وطریقت:

اللہ کے دین کے بارے میں یہ بات قرآن نے واضح کر دی ہے کہ رسولؐ اللہ کے ذریعے سے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور اس میں اب کسی اضافے یا کمی کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی نہیں، قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس اکمال دین کی صورت میں اتمام نعمت بھی ہوا ہے۔ لہذا عوام وخواص کے وہ سب مراتب، جو دین میں مطلوب ہیں، ان کے لئے ساری ہدایت اسی میں ہے: اليوم اكملت لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الاسلام دينا [۲۴] اسی بنا پر حضورؐ اکثر فرمایا کرتے تھے: فانّ خير الحديث كتاب اللّٰه وخير الهدى هدى محمد وشرّ الامور محدثاتها وكلّ محدثة بدعة وكلّ بدعة ضلالة [۲۵]

اہل تصوف کے ہاں دین میں اللہ تعالیٰ کی یہ ساری ہدایت، جو قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہے، درحقیقت عوام الناس کی اصلاح کیلئے ایک عمومی ضابطہ ہے، جبکہ خواص اور اخص الخواص کے مراتب فنا وبقا اور تمکین تام تک پہنچنے کیلئے یہ ہدایت کافی نہیں۔ ان کے نزدیک درجہ ''احسان'' کے حصول کیلئے محض قرآن وسنت میں بیان کردہ اعمال ووظائف کافی نہیں بلکہ مزید مجاہدات وریاضات کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں:۔

''جناب رسول اللہ ﷺ کی قوت روحانی کی یہ حالت تھی کہ بڑے سے بڑے کافر کو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہی مرتبہ ''احسان'' حاصل ہو جاتا تھا۔...... اوران کو مجاہدات اور ریاضات کی ضرورت نہ ہوتی تھی اور یہ قوت بہ فیض نبویؐ صحابہ میں تھی، مگر جناب رسول اللہ ﷺ سے کم تھی اور تابعین میں تھی، مگر صحابہؓ سے کم تھی، لیکن تبع تابعین میں یہ قوت بہت ہی کم ہو گئی اور اس کی تلافی کیلئے بزرگوں نے مجاہدات اور ریاضیات ایجاد کئے''۔ [۲۶]

تعذیب نفس پرمبنی ایجاد کردہ ریاضات ومجاہدات کی تائید میں کہا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے تو صرف اپنی امت پر شفقت کی وجہ سے کم عبادتیں کیں۔ کیونکہ آپ اگر زیادہ عبادت کرتے تو ساری امت پر ویسا ہی کرنا فرض ہو جاتا۔ اس استدلال کی کمزوری اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ عبادات میں تشدد کے بجائے آپ کا اعتدال اگر امت پر شفقت کی وجہ سے تھا تو آپ نے دعوت وتبلیغ دین کے معاملہ میں: لعلّك باخع نفسك الایکونوا مؤمنین [۲۷] کا اسوہ اپنی امت کیلئے کیوں چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندوں سے یہ مطلوب ہی نہیں کہ وہ اس قسم کے کرشمے دکھائیں کہ مغرب کے وضو سے نماز فجر چالیس سال تک پڑھتے رہیں اور روزانہ آٹھ آٹھ بار قرآن ''ختم'' کر ڈالیں۔ اپنے جسم کو غیر ضروری مشقت میں ڈالنا یا رات دن کچھ اشکال عبادت کو دہراتے رہنا، وہ چیز نہیں جو اللہ کو مطلوب ہو۔

شیوخ کی کرامات کی داستانیں اتنی کثرت سے پھیلائی گئی ہیں کہ وہ زبان وادب کا جزو بن گئی ہیں۔ صحابہؓ کے بعض خارقِ عادت واقعات، جو صحیح روایات میں آتے ہیں، ان کی حیثیت کرامت کی بجائے اہل ایمان کے اوپر اللہ کی نصرت کی ہے۔ کرامت بطور شخصی صفت کے، قطعاً ایک

غیر اسلامی تصور ہے۔ صحابہؓ کی کرامات اور موجودہ زمانہ کے بزرگوں کی کرامتوں کا فرق اسی سے واضح ہے کہ صحابہؓ کی کرامتوں نے عرب وعجم سے باطل کا استیصال کر دیا تھا جبکہ ہمارے بزرگوں کا حال یہ ہے کہ کرامت کی مفروضہ دنیا میں تو جن وانس، نباتات وحیوانات، وہ سب کو مسخر کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت کی دنیا میں ان کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ ان کے چاروں طرف باطل قوتیں اسلام اور ملت اسلامیہ کو روندرہی ہیں اور وہ اس کے دفعیہ کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔

پھر یہی نہیں، محاسن اخلاق یعنی صبر وشکر، صدق، ایثار، رضا، حیا، تواضع، توکل اور تفویض وغیرہ کے جو درجات اہل تصوف نے بیان کئے ہیں، ان کے لحاظ سے پیغمبر اور ان کے صحابہؓ کو بھی دیکھئے تو بمشکل پہلے یا دوسرے درجے تک ہی پہنچتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے آگے اخص الخواص کے درجے تک، صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کی رسائی بھی نہیں ہوسکی۔ تصوف کی امہات کتب، ''قوت القلوب''، ''منازل السائرین'' اور ''احیاء العلوم الدین'' کے مطالعے سے ہر شخص یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ اس معاملہ میں جو آخری مقامات اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں مقرر کئے ہیں، اہل تصوف کا ہدف ان سے فی الواقع بہت آگے ہے۔ اور اس ہدف تک رسائی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان تشدد ورہبانیت کو اختیار نہ کرے اور رہبانیت وہ چیز ہے جس سے اللہ نے بھی قرآن میں منع کیا اور احکام دین میں تشدد سے بچنے کی رسول اللہ ﷺ نے بھی بار بار تاکید کی۔ حضورؐ کی نظر میں دین میں شدت پسندی کس قدر خطرناک تھی، اس کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے:

''اخرج ابن جریر وعبدالرزاق وابن المنذر عن ابی قلدیة قال: اراد الناس من اصحاب النبیؐ ان یرفضوا الدنیا ویترکوا النساء ویترهبوا فقام رسول اللّٰه فغلط فیهم المقالة، ثم قال انما هلك من کان قبلکم بالتشدید. شدّدوا علی انفسهم فشدّدالله علیهم فاولئك بقایاهم فی الدیار والصوامع. اعبدوا اللّٰه ولا تشرکوا به شیئاً وحجّوا واعتمروا واستقیموا یستقم بکم۔'' [۲۸]

مولانا اصلاحیؒ کا تجدیدی کارنامہ ہے کہ انہوں نے علم تزکیہ کو ایک سربستہ راز اور مخصوص گروہ کی میراث اور اسی سے سینہ بسینہ دوسروں تک منتقل ہونے کے تصور کو تسلیم کرنے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں ایک قابل فہم اور قابل عمل تصور تزکیہ پیش کیا۔ فرماتے ہیں:

''تزکیہ ایک عام ضرورت کی چیز ہے، ہر شخص آخرت کی نجات وفلاح کیلئے اسکا محتاج ہے۔ انبیاء آتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ افراد کا بھی تزکیہ کریں اور معاشرہ کا بھی۔ پھر جو چیز اس قدر عمومی ضرورت کی ہو اس کو صرف چند خاص خاص افراد کے سینہ کا راز بنا کے کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص ہر علم کا اہل کا نہیں ہوا کرتا، اس وجہ سے اگر ایک شخص اس علم کا ذوق رکھنے والا نہ ہو تو وہ اس سے محروم رہے گا۔ علی ہذالقیاس اہل علم میں فرق مراتب بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے سارے جاننے والے ایک درجہ کے نہیں ہو سکتے لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ کوئی پراسرار علم ہے جس کے جاننے والے زمانہ صحابہ میں بھی چند افراد تھے اور بعد میں خال خال افراد ہی ہوئے۔ جو چیز ہوا پانی کی طرح ہر شخص کیلئے ضروری ہے، یہ کس طرح ممکن ہے کہ نبیؐ اس کو بس ایک دو آدمیوں کے کانوں میں پھونک کر چلے جائیں، دوسروں کو اس کی خبر نہ ہونے پائے۔'' ۲۹

اہل تصوف کے ہاں علم تزکیہ کے سینہ بسینہ منتقل ہونے کے استدلال کی بنیاد حضرت ابوہریرہؓ کی، علم کے دو ظروف والی حدیث ہے۔ اس حدیث سے صوفیاء کے اخذ کردہ مفہوم کو مولانا نے بدلائل رد کیا ہے اور اس بات کا اظہار کیا کہ قرآن کے اندر اسرار و حکم کے موجود ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسرار و حکم کے اس خزانہ پر کسی خاص گروہ کا اجارہ نہیں ہے۔ اس خزانہ میں سے بقدرِ صلاحیت واستعداد وہ لوگ حصہ پاتے ہیں جو کتاب الٰہی پر تدبر کرتے ہیں اور ان شرائط کے ماتحت تدبر کرتے ہیں جو قرآن پر تدبر کیلئے مقرر ہیں۔ ۳۰

معرفت نفس اور معرفت الٰہی کی بنیادی سوالات:

تزکیہ کا موضوع نفس انسانی ہے لیکن خود نفس کیا ہے؟ یہ ایک بڑا اہم سوال ہے اس بارے میں فلاسفہ اور صوفیا نے بڑی پیچیدہ بحثیں کی ہیں۔ مولانا کی رائے میں جس طرح کا تجزیہ فلسفی لوگ کسی چیز کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کیلئے کیا کرتے ہیں، ان کے نزدیک نہ تو اس سے نفس کی حقیقت و ماہیت ہی معلوم ہو سکتی ہے اور نہ اس مقصد کیلئے حقیقت و ماہیت معلوم کرنا کچھ ضروری ہے۔ مولانا ایک عملیت پسند (Pragmative) ہونیکے اعتبار سے صرف نفس کی صفات اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے صرف ان عقلی واخلاقی پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں جو علم تزکیہ میں زیر بحث آتے ہیں یا آنے چاہیں۔ چنانچہ عملی تزکیہ کے تحت نفس کے دو پہلوؤں کو پیش کرتے

ہیں: ایک یہ کہ ہمارا نفس ادراک کرتا ہے، دوسرا یہ کہ ہمارا نفس عمل کرتا ہے۔ [31] تزکیہ علوم و ادارک کے بارے میں بڑے دقیق مضامین اور مشکل سوالات کو بڑی عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''مقدم شے یہ ہے کہ پہلے وہ بنیادی سوالات طے کر دیئے جائیں جو فکر و نظر کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کیلئے ضروری ہیں، مثلاً یہ کہ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جائیں گے؟ ہم خالق ہیں یا مخلوق؟ مختار ہیں یا مجبور؟ غیر مسئول ہیں یا کسی کے آگے جوابدہ؟ اگر کسی کے آگے جوابدہ ہیں تو اسکی صفات کیا ہیں؟ ہماری زندگی کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہے؟'' [32]

معرفتِ الٰہی کے ذرائع:

معرفتِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟ اس اہم سوال کا جواب فلاسفہ متکلمین اور ارباب تصوف نے اپنے اپنے رنگ میں دینے کی کوشش کی ہے یہ الگ بات ہے کہ یہ تمام گروہ تضادِ فکر اور فسادِ فکر کا شکار ہوئے اور اس سوال کا صحیح جواب تو کیا دیتے، انہوں نے معاملے کو مزید پیچیدہ تر بنا دیا۔

مولانا ان کی فکر پر تنقید کرتے ہوئے ان سوالات کا احاطہ کرتے ہیں جو فطری طور پر ذہن میں اٹھتے ہیں:

''اگر گہری نظر سے انسان کا ذہنی و فکری تجزیہ کیا جائے تو اس واقعہ سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ اسباب خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن انسان اسی ترتیب سے سوچتا ہے اور اسی ترتیب سے وہ اپنے ذہن میں ابھرتے ہوئے سوالات کو حل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے سامنے پہلے یہ سوال نہیں آتا ہے کہ اس کا وجود کن اجزاء سے بنا ہوا ہے بلکہ پہلے وہ اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہے کہ اس کو پیدا کس نے کیا ہے؟ اسی طرح اس کے ذہن میں پہلے یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ جو پانی وہ پی رہا ہے اس میں کن کن اجزاء کی کتنی کتنی مقدار شامل ہے اور جو غذا وہ کھا رہا ہے، وہ کن کن وٹامنی جوہروں پر مشتمل ہے بلکہ ان سوالات کے پیدا ہونے سے پہلے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ وہ ذات کون ہے جس نے اس کیلئے بلا کسی استحقاق کے یہ خوان بچھایا ہے اور اس ذات کی صفتیں کیا ہیں؟ اور اس کے ساتھ اسکے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ علیٰ ھذا القیاس......''۔ [33]

تزکیۂ علم یہی ہے کہ انسانی ذہن میں فطری طور پر ابھرنے والے ان سوالات کا انسان کو تشفی بخش جواب مل جائے کہ اس کائنات کا خالق و مالک اور مدبر کون ہے؟ انسان کیلئے خوان نعمت بچھانے

والی ذات کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کائنات کی غایت کیا ہے؟ اس کائنات میں انسان کی حقیقت اور ان دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ ان سادہ وآسان سوالات کے عام فہم اور صحیح جواب سے انسان کے قلب وروح کو حقیقی طمانیت حاصل ہوتی ہے اور اسی سے علم حقیقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ مولانا کے الفاظ میں: ''یہی وہ سرا ہے جو مل جائے تو اس کائنات کا سارا الجھاؤ لمحہ بھر میں سلجھ سکتا ہے، اور اگر نہ ملے تو انسان قیامت تک سر مارتا رہے لیکن وہ کسی ایک گرہ کو بھی نہیں کھول سکتا۔'' ۳۴

محرکات عمل کی تعیین:

تزکیہ عمل کے بارے میں سب سے زیادہ اہم سوال اعمال کے محرکات سے متعلق پیدا ہوتا ہے۔ انسان کے اعمال کی محرک کوئی ایک شے نہیں بلکہ مختلف محرکات ہیں جن میں سے ہر محرک کا عمل کے مزاج پر براہ راست اثر پڑتا ہے پھر ہمارے اندر جتنے بھی محرکات ہیں ان کے متعلق یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کن پر اعتماد کیا جائے اور کونسے ایسے ہیں جن کی ترغیب وتحریک قبول کرنے میں اندیشے اور خطرے ہیں۔ ایسے محرکات کا مولانا عام فہم تجزیہ پیش کرتے ہیں:

''کبھی ہم کوئی عمل کسی ضرورت کی تحریک سے کرتے ہیں؛ مثلاً بھوک لگتی ہے تو کھانا کھاتے ہیں، پیاس لگتی ہے تو پانی پیتے ہیں، تھکان محسوس ہوتی ہے تو آرام کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم بہت سے عمل خواہشوں کی تحریک سے کرتے ہیں؛ مثلاً شہرت وناموری کے حصول کیلئے بہادری کے کام کرتے ہیں، ہردلعزیزی کے حصول کیلئے رفاہِ عام کے کارنامے انجام دیتے ہیں، دولت مند بننے کیلئے صنعت وحرفت اور تجارت کے کاروبار پھیلاتے ہیں۔ علیٰ ھذا القیاس ہمارے بہت سے کام جذبات کے تحت ہوتے ہیں؛ مثلاً ہم کسی سے محبت اور کسی سے نفرت کرتے ہیں، کسی پر حسد اور کسی پر مہربانی کرتے ہیں، کسی پر احسان کرتے اور کسی سے انتقام لیتے ہیں۔'' ۳۵

ان تین محرکات عمل کے بعد مولانا ایک چوتھے بالاتر محرک کا ذکر کرتے ہیں جس کے تحت ہمارے تعقل وتفکر اور ایثار وبے غرضی کے وہ سارے کام آتے ہیں جن کے اندر اپنے باریک ترین تجزیہ سے بھی ہم کسی نفسانی شائبہ کا سراغ نہیں پاتے۔ اس محرک کو روح ملکوتی یا نفس ناطقہ کے لفظ سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ ان چاروں قسم کے محرکات کا ہر عمل میں تجزیہ کرتے رہنا اور ان کی افراط وتفریط پر ان کا محاسبہ

کرتے رہنا اوران کوان کی فطری وشرعی حدود کا پابند بنا کر اس سلسلہ کو ایک خاص نظم کے تحت منظم کرنا بھی تزکیہ کے فرائض میں داخل ہے۔ ۳۶

تزکیہ عمل کی بحث میں مولانا نے عمل کے پانچ محرکات ،ضروریات ،خواہشات ،شہوات، جذبات اور نفس ناطقہ بیان کئے ہیں ان میں سے پہلے چار محرکات تو اندھے بہرے ہیں اور انسان کو حلال وحرام کی تمیز سے بے پرواہ بنا کر اپنے مرغوبات کی تکمیل پر ابھارتے ہیں البتہ پانچواں محرک عقلی واخلاقی ہے اس میں روح ملکوتی بھی ہوتی ہے تاہم اس کا نقص اس کا یک رخاپن ہے۔ اگر اس کو بغیر کسی روک ٹوک کے اپنی رَو پر بہنے کیلئے چھوڑ دیا جائے تو یہ دوسرے محرکات کے ساتھ رواداری برتنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات ان کو نہ صرف نظر انداز کر کے بلکہ ان کو پامال کرتا ہوا نکل جاتا ہے۔ اس کے اندر وہ ناہمواریاں اور بے اعتدالیاں پیدا ہوتی ہیں جن کے مظاہر ہم جوگیوں، راہبوں اور درویشوں کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ ۳۷

ترک دنیا کے اس انتہا پسندانہ رویہ کو افراد اور گروہ تو قبول کر سکتے ہیں لیکن پورا معاشرہ کبھی بھی انتہا پسند نہیں ہوسکتا۔ معاشرہ کیلئے تزکیہ کا قابل عمل نظریہ وہی ہوسکتا ہے جو اعتدال کے اصولوں پر مبنی ہو۔ جس میں اتنی لچک ہو کہ اعلیٰ وروحانی مراتب کے متلاشی اہل علم وفضل کیلئے اپنے اندر قلبی سرور طمانیت کا سامان بھی رکھتا ہو اور عوام الناس کی نفسانی کمزوریوں کی رعایت بھی کرتا ہو۔ تزکیہ نفس کے حجابات میں سے غفلت، حُبِ دنیا، خواہشات وشہوات اور جذبات کے مطالبات ہیں۔ مولانا اصلاحی نے غفلت کا علاج نماز، حُبِ دنیا کا انفاق فی سبیل اللہ، خواہشات وشہوات کا علاج روزہ اور ان تمام امراض کا مجموعی علاج حج بتایا ہے۔ انہوں نے ان پر ایسے دلکش، حسین اور اچھوتے پیرائے میں گفتگو کی ہے کہ یہ عبادات طبیعت پر بوجھ محسوس ہونے کے بجائے روحانی لذت اور قلبی سرور وطمانیت کا ذریعہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور پروانہ وار طبیعت ان کی طرف مائل ہوتی ہے۔

نماز کی ایک ایک چیز غفلت کو دور کرنے والی ہے۔ جسم اور لباس کی صفائی ،وضو، اوقات نماز، ہیئتِ نماز اور اس کی دعائیں انسان کے جسم اور قلب وروح کو فرحت وتازگی اور کیف ولذت سے سرشار کرتی ہیں۔ زکوٰۃ وانفاق فی سبیل سے حبِ مال پر کاری ضرب لگتی ہے اور بندہ کا تعلق مال کی بجائے مال کے خالق اور اس کی مخلوق سے جڑتا ہے اور حکمت جیسی خیر کثیر اسے حاصل ہوتی ہے۔ روزہ شہوانی میلانات کو کم کرنے ،خواہشاتِ نفسانی کا زور توڑنے ،قوتِ ارادہ کو مضبوط بنانے ،جذبہ ایثار

کی نشوونما اور رُوح ملکوتی کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے، روزہ بطن وفرج کے فتنوں کا دروازہ بند کرتا ہے اور تبتل الیٰ اللہ، خلوت وخامشی اور ذکر وفکر کا ایک خاص ماحول فراہم کرتا ہے۔ حج اللہ تعالیٰ کے ساتھ تجدید عہد ہے یہ انسان پر ہر راہ سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے ایمان کو بالیدگی ملتی ہے اور نفس انسانی اللہ تعالیٰ کی راہ میں مشقتیں برداشت کرنے کا عادی بنتا ہے۔ دورانِ حج شہوانی باتوں، فسق وفجور اور جدال کی سخت ممانعت ہے اور یہ چیزیں تزکیہ نفس اور معرفت کی ترقی کیلئے اکسیر کا حکم رکھتی ہیں۔

مولانا نے تزکیہ تعلقات ومعاملات پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ تزکیہ نفس صوفیا کی مانند تجرد وترک دنیا، انقطاع علائق اور تعذیبِ روح ونفس جیسے خلاف فطرت اور ناقابل عمل طریقوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ انفرادی واجتماعی معاملات میں اپنی شرعی ذمہ داریوں کے بدرجہ احسان ادا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عبادات جو تزکیہ کا سب سے اہم ذریعہ ہوتی ہیں اور اپنی روح کے اعتبار سے انفرادیت اور اخفا کی متقاضی ہوتی ہیں، اللہ نے ان کے ایک حصے کو بھی اجتماعیت سے جڑنے اور معاملات کی خوشگواری کا ذریعہ بنادیا ہے۔ معاملات کی درستگی ایک انسانی ضرورت ہے۔ ایک انسانی واجتماعی ضرورت کو مولانا نے تزکیہ نفس کے مضمون میں سمو کر اس علم کو ہر انسان کیلئے قابل فہم بنادیا ہے۔

خلاصہ بحث:

اس بحث سے یہ معلوم ہوا کہ تزکیہ نفس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ یہ عمل آسان اور قابل فہم ہو۔ ایسا پیچیدہ اور ناقابل عمل نہ ہو کہ چند اشخاص ہی اس پر عمل کرسکیں مولانا نے تزکیہ کے اس قابل فہم اور قابل عمل تصور کا احیاء بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ چنانچہ مولانا کے تزکیہ نفس کے قابل عمل تصور کی وجہ سے اسے تصوف کے حامی حلقوں میں بھی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کا اندازہ مولانا کی کتاب تزکیہ نفس پر ماہنامہ ''برہان'' دہلی کے اس تبصرہ سے ہوتا ہے۔ ''اس زمانہ میں، جبکہ علم وعمل کی ہزاروں قسم کی گمراہیوں نے مسلمانوں کے دل ودماغ پر اس طرح قبضہ کرلیا ہے کہ ان کا اچھے سے اچھا عمل اور فکر بھی ان کے اثرات سے آزاد نہیں، اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔'' ۳۸

☆........O........☆

مصادرومراجع

۱ البقرہ ۲ : ۱۲۹

۲ البقرہ ۲ : ۱۵۱

۳ آل عمران ۳ :۱۶۴

۴ تزکیہ نفس، ۱/۱۶۔۱۷

۵ عبس ۸۰ : ۱۔۳

۶ تزکیہ نفس، ۱/ ۱۸

۷ النازعات ۷۹ :۱۷۔۱۸

۸ الشمس ۹۱ :۹۔۱۰

۹ الاعلیٰ ۸۷ : ۱۴

۱۰ تزکیہ نفس ، ۱/ ۱۹

۱۱ ایضاً ،۱/ ۱۹۔۲۰

۱۲ القمر ۵۴ :۱۷

۱۳ تزکیہ نفس، ۲/ ۳۱

۱۴ ایضاً، ۱/ ۲۰۶۔۲۰۷

۱۵ ایضاً، ۱/ ۲۰۷

۱۶ شیخ الاسلام ابواسمعیل الہروی: منازل السائرین، ص:۵۱

۱۷ ایضاً، ص:۵۲

۱۸ امام غزالی: احیاء العلوم الدین، ۴/ ۲۴۰

۱۹ ابن عربی: فصوص الحکم، ص:۸۷

۲۰ شیخ مجدد الف ثانی: مکتوبات (فارسی) ، ۱/ ۱۴۷

۲۱ شاہ اسماعیل شہیدؒ: عبقات، اشارہ:۱، عبقہ: ۲۰/ ۸۴۔۸۵

۲۲ آل عمران ۳ :۱۸

۲۳ منازل السائرین، ص:۵۲، احیاء علوم الدین، :۴/ ۲۴۱

۲۴ المائدہ ۵ :۲۷

۲۵ المائدہ ۵ : ۳

۲۶ صحیح مسلم ،کتاب الجمعہ ، ۲/۳۲۳-۳۲۴

۲۷ مولانا اشرف علی تھانوی: ارواح ثلاثہ ، /۳۲۹

۲۸ الشعراء ۲۶:۳

۲۹ ابن جریر طبری: جامع البیان فی القرآن، ۷/ ، جلال الدین سیوطی: الدر المنثور، ۲/۳۰۷ ، ۶/۱۷۸

۳۰ تزکیہ نفس، ۱/۲۱-۲۲

۳۱ ایضاً، ۱/۳۱

۳۲ ایضاً ،۱/۳۹

۳۳ ایضاً، ۱/۴۱

۳۴ ایضاً ،۱/۴۶

۳۵ ایضاً ،۱/۴۶

۳۶ ایضاً، ۱/۴۱-۴۲

۳۷ ایضاً، ۱/۴۲

۳۸ ادارہ: ''تبصرہ کتب'' ماہنامہ 'برھان' دہلی، شمارہ ۴۹/۱ ، جولائی ۱۹۴۲ء، ص:۶۳

☆........O........☆